مملکت اور عقیدہ کا تعلق.........اسلامی جمہوریہ پاکستان کا تجربہ

حضرت مولانا محمد حنیف جالندھری
جنرل سیکریٹری وفاق المدارس العربیہ پاکستان

3 تا 5 اپریل 2014ء کرغیزستان کے شہر بشکیک میں ''سرچ فار کامن گراؤنڈ'' (SFCG) کے زیرِ اہتمام موجودہ عالمی تناظر اور موضوع کی اہمیت کے اعتبار سے ایک اہم سہ روزہ عالمی ٹریننگ ورکشاپ منعقد ہوئی۔ اس ورکشاپ میں پاکستان کے علاوہ ترکی، انڈونیشیا اور روسی فیڈریشن کے ممتاز دانشوروں نے شرکت کی۔ اس کے علاوہ کرغیزستان کے ایوان صدر، وزارت خارجہ، وزارت تعلیم کے اعلیٰ عہدیداران اور اصحاب علم بھی شریک ہوئے۔ احقر کو اس کانفرنس میں ''مملکت اور عقیدہ کا تعلق.... اسلامی جمہوریہ پاکستان کا تجربہ'' کے موضوع پر خطاب اور باہمی مکالمہ کا موقع ملا۔ احقر نے شرکاء کانفرنس سے جو گفتگو کی اس کا خلاصہ درج ذیل ہے۔ پاکستان میں جو افراد سیکولرزم کے فروغ کے لیے کوشاں ہیں اُن کے کئی سوالات کے جواب اس خطاب میں موجود ہیں.............................(مولانا محمد حنیف جالندھری)

الحمد للّٰہ وسلامٌ علٰی عبادہ الذین اصطفی. اما بعد

خواتین وحضرات، شرکاءِ مجلس و منتظمین مجلس!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ!

سب سے پہلے میں ''سرچ فار کامن گراؤنڈ'' (SFCG) کے منتظمین کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انہوں نے پاکستان سے مجھے ایک اہم ترین موضوع پر اظہارِ خیال اور تبادلۂ خیالات کے لئے اہلِ علم وفضل سے ملاقات وگفتگو کا موقع بخشا۔ میری دانست میں ''ایس ایف سی جی'' نے ایک ایسے موضوع کا انتخاب کیا ہے جو اس وقت کسی ایک ملک یا خطے میں زیرِ بحث نہیں بلکہ پوری دُنیا کے ایک گاؤں کی حیثیت اختیار کر جانے کے بعد ایک عالمی موضوع بن چکا ہے۔ ہر ملک کے اصحابِ فکر ونظر اور اہل اقتدار اس موضوع پر دلائل وافکار کا ایک بہت بڑا ذخیرہ رکھتے ہیں کہ ریاست کا مذہب سے تعلق ہونا چاہیے یا نہیں؟...... مذہب ایک اجتماعی مسئلہ ہے یا یہ ہر فرد کا انفرادی معاملہ ہے؟...... ریاست کو مذہبی اُمور میں مداخلت اور کسی ایک مذہب کو تقویت بہم پہنچانی چاہیے یا نہیں؟...... میری رائے میں اس موضوع پر نفیاً واثباتاً مباحث اور دلائل کا ایک انبار ہے جو آپ جیسے اصحابِ علم وفضل کی نظر سے یقیناً گزر چکا ہوگا۔

اس کانفرنس کا عنوان ''مملکت اور عقیدے کے تعلق پر بین الاقوامی تجربات: جمہوریہ کرغیز کے لئے ایک سبق'' ہے۔ اس میں مختلف ممالک کے فاضل مفکرین نے اپنے اپنے ملک کے حوالے سے تجربات کی روشنی میں آپ کے سامنے قابل قدر و فکر معلومات پیش کی ہیں۔ اسلامی جمہوریہ پاکستان کی نمائندگی کرتے ہوئے مجھے ''مملکت اور عقیدے کا تعلق، اسلامی جمہوریہ پاکستان کا تجربہ'' کے موضوع پر اپنی معروضات پیش کرنا ہیں۔

یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ انسانی زندگی میں مذہب کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ کیونکہ مذہب ہی انسانی زندگی کے اغراض و مقاصد کا تعین کرتا ہے اور یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ اگر انسانی زندگی کے راستے، منازل اور مقاصد کا تعین نہ ہو تو یہ زندگی عبث ہوگی۔ تمام مذاہب سماویہ کا اس بات پر اتفاق ہے کہ انسان کو اس دنیا میں ابتلا (Trial) کے لیے بھیجا گیا ہے اور اسے سلامتی اور گمراہی کے راستوں کی مکمل تفصیلات انبیاء و رُسل اور صحف و کتب سماویہ کے ذریعے سمجھا دی گئی ہیں۔ چنانچہ یہ بات کہنے میں کسی قسم کے شک کی گنجائش نہیں ہے کہ مذہب انسانی زندگی کے لیے بہترین ریگولیٹر ہے۔ انسانی زندگی میں مذہب کی اہمیت ہی کی بنیاد پر برصغیر میں آزادی کی تحریک ابھری۔ اس تناظر میں آپ حضرات کے علم میں ہوگا کہ پاکستان کا قیام ایک خاص پس منظر میں وجود میں آیا۔ تحریک پاکستان کے نتیجے میں بانیانِ پاکستان نے، برصغیر کے مسلمانوں کو ایک ایسا ماحول فراہم کرنے کے لیے جس میں وہ آزادی کے ساتھ اپنے دین کی تعلیمات پر مکمل طور پر عمل پیرا ہوسکیں، 1947ء میں پاکستان کے نام سے ایک آزاد خطے کا تحفہ دیا۔ مسلمانانِ ہند کی قیادت آزادی کی صورت میں ہندو اکثریت کے سائے میں مسلمان اقلیت کی اپنے دین اور اس کی تعلیمات پر آزادی سے عمل پیرا ہونے کے امکانات کے بارے میں مایوسی کا شکار تھی۔ برصغیر کے مسلمانوں کی عظیم اکثریت کو یقین تھا کہ متحدہ ہندوستان میں وہ اپنے مذہب کے تمام احکام پر آزادی کے ساتھ عمل پیرا نہیں ہوسکتے۔ اس کے لئے انہیں کسی ایسے خطے کی ضرورت ہے جہاں مسلمان اکثریت، اپنے دین پر آزادی سے عمل کرسکے اور دین کے تقاضوں کو بروئے کار لاسکے۔

آپ جانتے ہیں کہ اسلام بین الاقوامی مجموعہ قوانین کا نام ہے جو ''مذہب'' کے مفہوم سے بلند اور وسیع تر ہے، یہی وجہ ہے کہ اسلام نے اپنے لئے ''مذہب'' کا لفظ کبھی استعمال نہیں کیا بلکہ اس کے لئے ایک جامع اصطلاح ''دین'' کو اختیار کیا۔ جس کا حاصل یہ ہے کہ ''اسلام'' ایک ایسا ضابطہ حیات ہے جو زندگی کے تمام شعبوں میں خواہ وہ انفرادی ہوں یا اجتماعی، نجی ہوں یا ریاستی، معاشی ہوں یا معاشرتی، مملکتی ہوں یا عائلی...... ان تمام کے لئے نہ صرف رہنمائی فراہم کرتا ہے بلکہ پوری قوت سے یہ مطالبہ بھی کرتا ہے کہ اسلام پر یقین رکھنے والا ان پر عمل پیرا بھی ہو۔ کیونکہ انسان جس طرح اپنی تخلیق میں منفرد ہے اِسی طرح اِس کی تخلیق کا مقصد بھی منفرد اور اعلیٰ ہے۔ وہ زندگی گزارنے اور اس کا مقصد متعین کرنے میں آزاد و خودمختار ہے یا وہ کسی ہستی کے قوانین کا پابند ہے۔ اس کا فیصلہ کرنے سے قبل یہ جاننا ضروری ہے کہ اس وقت دنیا میں ڈیموکریسی کے مقابل ''تھیوکریسی'' کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ ڈیموکریسی سے

''عوام کی حکومت'' یا جمہوریت مراد لی جاتی ہے اور تھیوکریسی کو ''مذہبی اشرافیہ'' کی حکومت سمجھا جاتا ہے۔

آپ حضرات جانتے ہیں کہ تھیو(Theo) یونانی زبان میں خدا کو کہتے ہیں اور کریسی(Cracy) کا معنی حاکمیت ہے۔اس طرح ''تھیوکریسی'' کا معنی ہے ''خدا کی حاکمیت''۔اصل معنی کے اعتبار سے یہ تصور بڑا مبارک ہے کہ اس کائنات میں اصل حاکمیت اللہ تعالیٰ کی ہے اور یہاں جو بھی حکومت قائم ہو اسے اللہ تعالیٰ کے احکام کی پابندی کرنی چاہیئے۔لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام کا تعین کون کرے؟ مسیحی دنیا میں اس کا عملی جواب یہ تھا کہ چرچ کا سربراہ جو''پوپ'' کہلاتا تھا اسی کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے احکام کا تعین کر کے بادشاہ کو بتائے۔چنانچہ جس بات کو''پوپ'' اللہ تعالیٰ کا حکم قرار دے دے حکومت کا سربراہ اسی پر عمل کرنے پر مجبور ہے۔اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ''تھیوکریسی'' کا مطلب ''مذہبی پیشواؤں کی حاکمیت'' بن گیا۔چنانچہ اب ''تھیوکریسی'' کا ترجمہ کیا جاتا ہے تو بکثرت ''خدا کی حاکمیت'' کی بجائے ''مذہبی پیشواؤں کی حاکمیت'' کیا جاتا ہے۔

روم کی مسیحی حکومتوں میں عرصہ دراز تک یہ صورتحال رہی کہ اگرچہ حکومت کا سربراہ کوئی اور شخص ہوتا تھا لیکن عملاً قانون سازی کے تمام اختیارات ''پوپ'' کے پاس ہوتے تھے۔''پوپ'' نے اپنے اس اختیار کا ناجائز استعمال کرتے ہوئے بہت بے رحمانہ پالیسیاں اپنائیں جن سے پوری قوم کو جبر و تشدد کی فضا میں صدیاں گزارنی پڑیں۔ اس ساری صورت حال کے نتیجے میں عوام کے درمیان مذہب کے خلاف بغاوت پیدا ہوئی اور آخر کار انہوں نے حکومت سے مذہب کا عمل دخل ختم کر کے سیکولر نظام حکومت قائم کیا اور ''تھیوکریسی'' کا لفظ ایک گالی بن گیا کیونکہ اس لفظ کو سنتے ہی ان کے ذہن میں وہ ساری خرابیاں ابھر آتی ہیں جو پوپ کے ادارے نے پیدا کی تھیں۔

ہمارے ملک ''اسلامی جمہوریہ پاکستان'' کے بانیان نے جب ملک بناتے وقت یہ کہا تھا کہ پاکستان میں ''تھیوکریسی'' نہیں ہوگی تو اس کا مطلب یہی تھا کہ یہاں ''مذہبی پیشواؤں کی حاکمیت یا آمریت'' نہیں ہوگی اور جب وہ یہ کہتے تھے کہ پاکستان ایک جدید اسلامی، فلاحی، جمہوری ریاست ہوگا تو اس کا مطلب یہ تھا کہ پاکستان اسلام کی ایک ایسی تجربہ گاہ ہوگی جس میں اسلام کے آفاقی و عالمگیر تعلیمات کے مطابق ایسا نظامِ حکومت ہوگا جو یہاں کے رہنے والوں کے لئے دُنیا و آخرت کی فلاح کا ضامن ہوگا اور ہر شخص کو یہاں اپنے مذہب اور تہذیب کے ساتھ زندہ رہنے کا حق ہوگا۔چنانچہ پاکستان بننے کے فوراً بعد مارچ 1949ء میں پاکستان کی پہلی دستور ساز اسمبلی نے مُلک کے پہلے وزیراعظم نوابزادہ لیاقت علی خان کی قیادت میں قراردادِ مقاصد منظور کی۔1985ء میں اس قرارداد کو آئین کے آرٹیکل 2 (الف) کے طور پر دستور کا باقاعدہ حصہ بنادیا گیا۔قوانین کی اسلامی تشکیل کے لئے اس قرارداد کے مندرجہ ذیل اقتباسات اساسی اہمیت رکھتے ہیں۔

قراردادِ مقاصد: (ا)...... چونکہ اللہ تبارک وتعالیٰ ہی پوری کائنات کا بلاشرکتِ غیرے حاکمِ مطلق ہے اور پاکستان کے جمہور کو جو اختیار و اقتدار اس کی مقرر کردہ حدود کے اندر استعمال کرنے کا حق ہوگا، وہ ایک مقدس امانت ہے۔

(۲)...... چونکہ پاکستان کے جمہور کی منشا ہے کہ ایک ایسا نظام قائم کیا جائے جس میں "مملکت" اپنے اختیارات واقتدار کو جمہور کے منتخب کردہ نمائندوں کے ذریعے استعمال کرے گی۔

(۳)...... جس میں جمہوریت، آزادی، مساوات، رواداری اور عدلِ عمرانی کے اصولوں پر، جس طرح اسلام نے ان کی تشریح کی ہے، پوری طرح عمل کیا جائے گا۔

(۴)...... جس میں مسلمانوں کو انفرادی اور اجتماعی حلقہ ہائے عمل میں اس قابل بنایا جائے گا کہ وہ اپنی زندگی کو اسلامی تعلیمات ومقتضیات کے مطابق، جس طرح قرآن پاک اور سنت میں اس کا تعین کیا گیا ہے، ترتیب دے سکیں۔

(۵)...... لہٰذا اب ہم جمہوریہ پاکستان کے عوام ...... بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناحؒ کے اس اعلان سے وفاداری کے ساتھ کہ پاکستان عدل عمرانی کے اسلامی اصولوں پر مبنی ایک جمہوری مملکت ہوگی۔

دستور 1956ء کی اسلامی دفعات اور اسلامی کمیشن کا قیام:

دستور سازی کے عمل میں طویل تاخیر ہماری تاریخ کا ایک افسوس ناک باب ہے۔ تاہم 1956ء میں پاکستان کا پہلا دستور منصۂ شہود پر آیا تو قرارداد مقاصد کی روشنی میں آئین کے آرٹیکل 198 (1) میں طے کیا گیا:

(۶)...... ایسا کوئی قانون وضع نہیں کیا جائے گا جو قرآن پاک اور سنت میں منضبط اسلامی احکام کے منافی ہو اور موجودہ قوانین کو ان احکام کے مطابق بنایا جائے گا۔

(۷)...... اسی آرٹیکل (198) کی ذیلی شق 3 میں مندرجہ بالا حکم کو عملی جامہ پہنانے کے لئے قرار دیا گیا کہ:

جناب صدر دستور کے نفاذ کے دن سے ایک سال کے اندر ایک کمیشن مقرر کریں گے۔

(الف)...... کہ وہ سفارشات پیش کرے۔

(i)...... موجودہ قوانین کو احکامِ اسلام کے مطابق بنانے کے لئے اقدامات کے بارے میں۔

(ii)...... ان مراحل سے متعلق جن میں ایسے اقدامات نافذ العمل کئے جائیں۔ اور

(ب)...... کہ وہ قومی اور صوبائی مجالس مقننہ کی راہنمائی کی غرض سے احکامِ اسلام ایسی موزوں شکل میں مدون کرے جس میں انہیں قانونی شکل دی جاسکے۔

1956ء کے دستور کے آرٹیکل 198(3) کے تحت جو کمیشن قائم کیا جانا تھا وہ بوجوہ اکتوبر 1958ء میں اس دستور کی تنسیخ تک وجود میں نہ آسکا۔

دستور 1962ء کی اسلامی دفعات اور اسلامی نظریہ کی مشاورتی کونسل کا قیام:

(۸)...... اکتوبر 1958ء میں جنرل محمد ایوب خان کے اقتدار پر قبضہ، مارشل لاء کے نفاذ اور 1956ء کے دستور کی تنسیخ کے بعد بالآخر 1962ء میں جو نیا دستور آیا۔ اس میں بھی آرٹیکل 199 کے تحت اسلامی نظریہ کی

مشاورتی کونسل کی تشکیل کا فیصلہ کیا گیا۔ آرٹیکل 204(1) میں اس کونسل کے مندرجہ ذیل فرائض منصبی طے کیے گئے:

(۹)......مرکزی حکومت اور صوبائی حکومتوں کو ایسی سفارشات کرنا جن کے ذریعے پاکستان کے مسلمانوں کو اپنی زندگیاں ہر لحاظ سے اسلامی نظریات کے مطابق مرتب کرنے کے قابل بنایا جاسکے۔ نیز اس کے لئے ان کی حوصلہ افزائی کی جاسکے اور دستور کی پہلی ترمیم کے قانون 1963ء کے نافذ ہونے سے فوراً پہلے نافذ العمل تمام قوانین کا جائزہ لینا تاکہ انہیں قرآنِ پاک اور سنت میں منضبط اسلامی تعلیمات اور تقاضوں کے مطابق بنایا جاسکے۔

مورخہ 4/اگست 1962ء کو وزارت قانون و پارلیمانی امور کے ایک نوٹیفکیشن کے ذریعہ اسلامی نظریہ کی مشاورتی کونسل کی اولین تشکیل کی گئی۔ اس پہلی کونسل کے چیئرمین جناب جسٹس ابوصالح محمد اکرم تھے۔ ارکان جسٹس (ر) محمد شریف، مولانا اکرم خان، مولانا عبدالحمید بدایونی، مولانا حافظ کفایت حسین، ڈاکٹر ٹی ایچ قریشی اور مولانا عبدالہاشم شامل تھے۔

دستور **1973**ء کی اسلامی دفعات اور اسلامی نظریاتی کونسل کی تشکیل

1973ء کے دستور کے آرٹیکل 2 میں اسلام کو ریاستِ پاکستان کا دین قرار دیا گیا اور آرٹیکل 227 تا 231 میں قوانین کی اسلامی تشکیل اور اس مقصد کے لئے کونسل کے کردار کی وضاحت سے تصریح کر دی گئی ہے۔ آرٹیکل 227(1) میں بصراحت قرار دیا گیا کہ:

(۱۰)......"تمام موجودہ قوانین کو قرآنِ پاک اور سنت میں منضبط اسلامی احکام کے مطابق بنایا جائے گا، جن کا اس حصے میں بطور اسلام احکام حوالہ دیا گیا ہے اور ایسا کوئی قانون وضع نہیں کیا جائے گا جو مذکورہ احکام کے منافی ہو"۔

اسلامی نظریاتی کونسل کی ہیئت ترکیبی:

اسی آرٹیکل کی ذیلی شق (2) میں مزید تصریح کر دی گئی کہ ذیلی شق (1) کے احکام کو عملی شکل دینے کے لئے وہ طریق اختیار کیا جائے جو دستور کے اس حصے یعنی جزء 9 بعنوان "اسلامی احکام" میں بیان کیا گیا ہے۔

آرٹیکل 228 میں اس کی تعبیر و تصریح کرتے ہوئے قرار دیا گیا ہے کہ:

(۱۱)......یوم آغاز سے نوے دن کی مدت کے اندر ایک اسلامی نظریاتی کونسل تشکیل دی جائے گی جس کا اس حصے میں بطور اسلامی کونسل حوالہ دیا گیا ہے۔

اسی آرٹیکل 228 کی ذیلی شق (2) میں اسلامی نظریاتی کونسل کی ہیئت ترکیبی کی وضاحت کی گئی ہے:

(۱۲)......اسلامی کونسل کم از کم آٹھ اور زیادہ سے زیادہ بیس ایسے ارکان پر مشتمل ہوگی جنہیں صدر ان اشخاص میں سے مقرر کرے گا جو اسلام کے اصولوں اور فلسفے کا، جس طرح کہ قرآن پاک و سنت میں ان کا تعین کیا گیا ہے، علم رکھتے ہوں یا جنہیں پاکستان کے اقتصادی، سیاسی، قانونی اور انتظامی مسائل کا فہم و ادراک حاصل ہو۔ دستور کی یہ تمام دفعات اس لیے ہیں کہ پاکستان کے عوام اپنی زندگیاں اسلام کے سانچے میں ڈھال سکیں۔

آرٹیکل 228 کی اگلی ذیلی شق (3) کی رو سے یہ لازم قرار دیا گیا ہے کہ کونسل کے کم از کم دو ارکان سپریم کورٹ یا کسی ہائی کورٹ کے حاضر سروس یا سابق جج ہوں گے۔ اسی طرح کم از کم ایک خاتون رکن کا ہونا بھی ضروری قرار دیا گیا ہے اور کونسل کے ارکان میں کم از کم چار، اسلامی علوم کی تدریس و تحقیق کے کم از کم پندرہ سالہ تجربہ کے حامل ہونے چاہئیں۔

اس وقت جدید تعلیم یافتہ طبقہ ''تھیوکریسی'' کے جس تصور کی مخالفت یا تردید کرتا ہے حقیقت یہ ہے کہ اس کا اسلامی حکومت یا سیاست میں علماء کرام کی شمولیت سے کوئی تعلق نہیں۔ اسلامی حکومت یا کتاب و سنت کے مطابق قانون سازی اور رومی مسیحی تھیوکریسی کے درمیان بعد المشرقین ہے جو درج ذیل حقائق سے بالکل واضح ہو جاتا ہے:

(۱)......انجیلوں میں سیاست و حکومت سے متعلق احکام نہ ہونے کے برابر ہیں، اس لئے ان احکام کو وضع کرنے کا تمام اختیار مذہبی پیشواؤں کو حاصل ہے۔ اس کے برعکس اسلامی احکام کی بنیاد قرآن کریم اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر ہے اور ان دونوں میں مجموعی طور پر صریح احکام کی ایک بڑی مقدار موجود ہے اور جہاں واضح نصوص موجود ہوں وہاں کسی شخص کی انفرادی رائے کا کوئی اعتبار نہیں۔

(۲)......مسیحیوں کے ہاں ''کلیسا'' ایک مستقل ادارہ ہے، جس کے افراد کو انسان ہی منتخب کرتے ہیں اور یہ ادارہ جو قانون طے کر دے اس سے کسی کو اختلاف کا حق حاصل نہیں۔ اس کے برعکس اسلام میں اس قسم کا کوئی ادارہ موجود نہیں۔ البتہ قرآن و سنت کی تعبیر و تشریح کے لئے منطقی طور پر اہلیت کی کچھ شرائط ضرور مقرر ہیں۔ جو کوئی ان شرائط پر پورا اترتا ہو وہ قرآن و سنت کی تعبیر و تشریح کر سکتا ہے۔ اس کے بعد کوئی لگا بندھا ادارہ نہیں بلکہ امت کا اجتماعی ضمیر اسے قبول یا رد کرنے کا فیصلہ کرتا ہے۔

(۳)......مسیحیت میں پوپ کو تشریعی معاملات میں معصوم عن الخطاء قرار دیا گیا ہے۔ اس کے برعکس اسلامی عقیدے کی رو سے عصمت صرف انبیاء علیہم السلام کے ساتھ خاص ہے اور نبوت کا سلسلہ ختم ہونے کے بعد نہ کوئی عصمت کا دعویٰ کر سکتا ہے اور نہ آج تک کسی بڑے سے بڑے عالم نے یہ دعویٰ کیا ہے۔

لہٰذا مسیحی تاریخ میں جو ''تھیوکریسی'' رہی ہے اس کو اسلامی نظام حکومت پر چسپاں کرنا نامناسب ہے۔ آج کل جب اسلامی حکومت کی بات کی جاتی ہے تو بعض لوگ کہتے ہیں کہ علماء پاپائیت قائم کرنا چاہتے ہیں۔ یہ بات درحقیقت پاپائیت کی اصل اور اسلام میں علمائے دین کے کردار کو نہ سمجھنے کا نتیجہ ہے۔

''اسلامی جمہوریہ پاکستان'' میں عقیدے اور مملکت کے تعلق کے ضمن میں، میں آپ کے سامنے یہ حقیقت بھی رکھنا چاہتا ہوں کہ پاکستان ایک جدید جمہوری اسلامی ریاست ہے۔ مسلم دنیا میں ملائیت (تھیوکریسی بمعنی مذہبی شخصیات کی حاکمیت) اور بادشاہت کے مروجہ نظاموں کے برعکس پاکستان دنیائے اسلام میں اسلامی جمہوریت کا پہلا تجربہ ہے۔ ہمارے ملک میں قانون سازی کا عمل پارلیمنٹ انجام دیتی ہے نہ کہ مذہبی شخصیات، تاہم آئین کی رو سے پارلیمنٹ اس بات کی پابند ہے کہ وہ کوئی قانون کتاب و سنت کے خلاف نہ بنائے۔ جمہوریت کا یہ تصور مسلم دنیا میں اس سے پہلے کہیں نہ تھا۔

میں ارباب علم وفضل کی خدمت میں یہ بھی عرض کرنا چاہوں گا کہ سیکولرازم، ردعمل کا نام ہے اور ردعمل ہمیشہ اعتدال سے محروم ہوتا ہے۔ مغربی دنیا اس لئے سیکولر ہوئی تھی کہ کلیسا نے اپنی خواہشات کو مذہب کا نام دے دیا تھا۔ اب ایک عام آدمی کے لئے ممکن نہ تھا کہ وہ کلیسا کی غلطیوں پر سرِتسلیم خم کر دیتا۔ اعتراض کرنیوالوں کو کلیسا ''اِنکوزیشن کورٹ'' (Inquisition Court) کے حوالے کر دیتا کہ یہ دین کا باغی ہے۔ چنانچہ برُونو اور گلیلیو کو زندہ جلا دیا گیا، ان کی سائنسی تحقیقات ''کلیسا'' کے پادریوں کے خیالات سے متصادم تھیں اور پادریوں کا کہنا تھا کہ مذہب وہی ہے جو وہ کہیں۔ اس ردعمل میں سب ہی نے مذہب سے بغاوت کر دی۔ ہمارے پاس چونکہ قرآن وسنت موجود ہے، ہم مذہبی انتہاء پسندی کو قرآن وسنت کی بنیاد پر پرکھ سکتے ہیں اور رد بھی کر سکتے ہیں اس لئے کہ معیار صرف قرآن وسنت ہے۔ اصل راستہ سیکولرزم نہیں، اصل راستہ تو اعتدال کا راستہ ہے۔ اگر مذہب اعتدال کی مکمل رہنمائی کرے تو کیا راہ اعتدال کو صرف اس لیے چھوڑ دیا جائے کہ وہ مذہب کی بتائی ہوئی ہے؟

جمہوریہ کرغزستان سمیت جن ممالک کی غالب اکثریت مسلمانوں پر مشتمل ہے ان کا یہ جمہوری حق ہے کہ انہیں اپنے دین پر عمل کرنے کی مکمل آزادی حاصل ہو۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ سیکولرازم میں بھی ہر شخص کو مذہبی آزادی حاصل ہوتی ہے۔ جواب یہ ہے کہ ہندومت، عیسائیت اور یہودیت میں مذہب ریاست کے بغیر اور ریاست مذہب کے بغیر قابل عمل ہے۔ لیکن اسلامی طرزِ زندگی اس وقت تک کامل نہیں ہوسکتا جب تک وہ نجی خانے سے ریاستی بالاخانے تک منتقل نہ ہو۔ اسلام نجی اور عوامی (پرائیویٹ اور پبلک) دائروں کی تقسیم روا نہیں رکھتا۔ یہاں ایک ہی دائرہ ہے۔ زندگی ایک ہی دائرہ کا سفر ہے جو خاندان کی ریاست سے شروع ہو کر حکومت وریاست کے ایوانوں میں اپنے عروج کو پہنچتی ہے۔ اس کے بغیر اسلامی زندگی کا تصور ممکن نہیں۔ یہ بات بھی پیشِ نظر رہے کہ اسلام صرف مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کو منضبط کرنے کے لیے معاشرہ اور ریاست کی تشکیل نہیں کرتا، بلکہ وہ پوری کائنات اور خطۂ ارض میں بسنے والی اقوام کو امن اور سلامتی کا ماحول فراہم کرنے کے لیے بین الاقوامی تعلقات کا ایک ایسا نظام تشکیل دیتا ہے جس سے کرۂ ارض میں بسنے والی اقوام ایک دوسرے کے پڑوس میں پُرامن زندگی بسر کرسکیں۔

آخر میں یہ گزارش بھی کرنا چاہتا ہوں کہ اقوامِ متحدہ کا عالمی چارٹر، ایک انسان کو جب مذہبی آزادی کا بنیادی حق دیتا ہے تو اِس حق کی اجتماعی خواہش کو بھی تسلیم کیا جانا چاہیے۔ ایک مُلک یا علاقے میں رہنے والے اگر چاہیں کہ اُن کا سیاسی اور ریاستی نظام اُن کے مذہبی افکار سے ہم آہنگ ہو تو انہیں یہ حق دیا جانا چاہیے اور یہی جمہوریت کا تقاضا ہے۔ ریاست اور عقیدہ، دونوں انسانی ضروریات ہیں۔ کسی بھی مذہب کے اخلاقی اور سماجی اصولوں کے مطابق جو ریاست اپنے اُمور کی انجام دہی کرے گی اس میں اسے آسانی بھی ہوگی۔ اور ریاست اور عوام کے درمیان تصادم اور تزاحم بھی نہیں ہوگا۔ کیونکہ وہ لوگوں کے ذہنی مزاج سے ہم آہنگ ہوگی۔

اقول قولی هذا واستغفر الله العظیم